(غلام گردش)

فریدا تن سُکا، پنجر تھیا، تلیاں کھونڈیں کاگ!

تصوف ایک گہرا سمندر ہے۔اتنی گہرائی کہ انسان کی روح ڈوب جاتی ہے مگر آخری سطح ہرگز نہیں آتی۔صوفی اور بزرگ فقر کے موتیوں جیسے پانی سے شرابور ہوتے ہیں مگر اظہار نہیں کرتے۔قطعاً گرہ نہیں کھولتے۔مگر عامی، معمولی سا علم حاصل کرنے کے بعد، لوگوں میں سرفرازی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔درویش بہت ہی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔شہرت، نمود اور نمائش سے ہزاروں نوری سال دور۔جبہ ودستار سے بھی بہت گریزاں۔نامعلوم سے معلوم تک کا سفر اس طرح گزارتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو پائے۔

کیا کیا ہیرے، سفرِ تصوف میں پیہم جگمگاتے رہتے ہیں۔ایسی ایسی روحانی تراش کے مالک کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔عقل تو ویسے ہی بہت تھوڑی دور تک سفر کر پاتی ہے۔عقل بذات خود محدود ہے۔مگر سلوک کی اصل منزل صرف اور صرف جذب طے کرواتا ہے۔بختیار کاکی کا نایاب جملہ اس اُجلے سفر کی ایک کڑی ہے۔

مقام ما مقام شماست!

ترجمہ: میرا مقام، تمہارا مقام ہے

بختیار کاکی محفل سماع میں گئے۔یہ شیخ علی سنجری نے برپا کی تھی۔ایک شعر سنا تو حالت جذب میں چلے گئے۔حالت یہ ہوگئی کہ عالم استغراق میں پہنچ گئے۔اس کیفیت سے کبھی باہر نہ آپائے۔اسی طرح دنیا سے رخصت ہوگئے۔عشق کے قافلے کے یہ مسافر، اپنی طرز کے بندے ہوتے ہیں۔انکا نہ ہی کوئی ہمسفر ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی قافلہ۔یہ قافلے بھی خود ہوتے ہیں اور ہمسفر بھی صرف اور صرف اپنے۔دنیا جو نہیں دیکھ سکتی، وہ انکی آنکھ کے سامنے آشکارہ کردیا جاتا ہے۔جب بختیار کاکی کو اپنے وصال کا معلوم ہوا تو بابا فریدؒ نے حانس میں خواب دیکھا کہ انہیں دہلی بلایا جارہا ہے۔بختیار کاکی کے دربار میں۔یہ دراصل موت کا اعلان تھا۔تین دن بعد جب بابا فریدؒ دہلی پہنچے تو انکے مرشد دنیا سے پردہ کرچکے تھے۔سوال ہے۔سوال کیا، ذہن میں ایک دھند ہے۔کیا ان لوگوں کو موت کا بتادیا جاتا ہے۔کیا یہ اس روحانی بالیدگی کے حامل ہوتے ہیں کہ کسی کو خواب میں آکر بلانے پر قادر ہوجاتے ہیں۔سمجھ نہیں آتا کہ کیسے۔مگر یہ ہوتا ہے۔بات صرف بختیار کاکی اور بابا فریدؒ کی نہیں۔ہر صاحبِ بصیرت انسان، زمانے کو بدلنے پر قادر ہوجاتا ہے۔مگر کیسے! اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔شائد ہونا بھی نہیں چاہیے۔

سائنس کی دنیا کا آدمی ہے۔بارہا عرض کرچکا ہوں کہ عمل اور ردِعمل کی دنیا میں سانس لیتا ہوں۔مگر اکثر مقامات پر کسی قسم کی کوئی توجیح کام نہیں آتی۔دیکھا جائے تو تصوف ایک ایسی کائنات ہے جس میں حواسِ خمسہ بے بس ہوکر عاجز سے نظر آتے ہیں۔آنکھ کی طاقت بے حد محدود ہے۔ڈاکٹر کے طور پر عرض کررہا ہوں کہ یہ صرف سات رنگوں کو دیکھنے کی استطاعت رکھتی ہے۔عام آدمی صرف اور صرف انہی رنگوں کی آمیزش دیکھنے پر قادر ہے۔یہاں سے ہی وہ دلیل جنم لیتی ہے کہ اگر آنکھ صرف سات رنگ دیکھ سکتی ہے۔تو کیا اسکے علاوہ رنگ نہیں ہوسکتے ہیں۔لازم ہے کہ ہوسکتے ہیں۔ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہوسکتے ہیں۔کیا اتنی محدود بصیرت، انسان کو سب کچھ دکھا سکتی

ہے۔ جواب نفی میں ہے۔ کچھ دیکھنا ممکن ہے۔ مگر سب کچھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ محدود سے لامحدود کی طرف جانے کی قوت دراصل اس آنکھ میں موجود ہی نہیں۔ مگر صوفی تو بہت زیادہ رنگ دیکھتا ہے۔ بہت زیادہ۔ اکثر کا اظہار نہیں کرتا۔ اسکا سفر محدود سے لامحدود کی جانب ہے۔ ایسا سفر جو خفی ہے۔ ہر ایک پر یہ راز کھلتا بھی نہیں۔ شائد کھلنا بھی نہیں چاہیے۔

سننے کی قوت کی طرف آیئے۔ کسی بھی ڈاکٹر یا سائنسدان سے پوچھ لیجئے۔ انسانی سماعت کی طاقت صرف اور صرف ایک مخصوص پیمانے میں ہے۔ چند ڈیسی بلز (Decibels) کے درمیان۔ مگر سائنس ہی کے مطابق، آواز، اس رینج سے اوپر بھی ہے اور نیچے بھی۔ کیا کوئی سن سکتا ہے۔ عام آدمی تو خیر قوت سماعت کے اندر بھی کچھ سن نہیں پاتا۔ اگر سنتا ہے تو سمجھ نہیں پاتا۔ مگر خواص تو ہر آواز سن پاتے ہیں۔ انکی سننے کی طاقت، قدرت کی طرف سے بہت زیادہ کر دی جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کچھ جانوروں کی قوت سماعت، خدا کی طرف سے بڑھا دی جاتی ہے۔ کئی تو آنے والے خطرے تک کو محسوس کر سکتے ہیں۔ عام انسان پر یہ در بند کر دیا گیا ہے۔ مگر صوفی تو اس بند دروازے کے باہر کا مکین ہے۔ مکمل طور پر ہر چیز سننے کے باوجود، "سادہ "سا دکھائی دیتا ہے۔ اہم ہونے کے باوجود، غیر اہم نظر آتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ لوگوں سے دور رہے۔ پہچانا نہ جائے۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو پائے کہ حقیقت کیا ہے۔ راز کو راز ہی رکھنے کی کوشش میں سلوک کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔

ہاں ایک اور بات۔ صوفی کسی کی بھی اَنا کو مجروح نہیں کرتے۔ اپنے اندر کی روحانی لو کو قائم رکھتے ہیں۔ مگر کسی بھی صورت میں لوگوں کو کسی قسم کا دکھ نہیں دیتے۔ اصل میں وہ ہر طرح سے برگزیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی عالم یا عامی، انہیں علم کی کسوٹی پر پرکھ کرنا کام قرار تک دے دے۔ پھر بھی یہ لوگ خاموش رہتے ہیں۔ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں ایک زبردست عالم، مولانا فصیح الدین تھے۔ انہیں اپنے بھرپور علم پر زعم بھی تھا اور کچھ تکبر بھی۔ بابا فریدؒ کی شہرت سنی تو اجودھن آ گئے۔ بابا فریدؒ سے مذہب کے دقیق مسائل پر بحث کرنی چاہی۔ صاحب نظر تو خاموش رہا۔ مگر انہی کے ایک شاگرد نے فصیح الدین کو حد درجہ عمدہ جواب دیے۔ مولانا، تو اپنے آپکو وقت کا سب سے عظیم عالم گردانتے تھے۔ جب بابا فریدؒ کے ایک شاگرد نے تمام جزئیات بتا ڈالیں تو مغموم ہو کر واپس دہلی پہنچ گئے۔ غور سے پرکھیے۔ بابا فریدؒ نے اپنے طالبعلم سے خفگی کا اظہار کیا کہ درویش تو کسی بھی حالت میں کسی کی بھی دلآزاری نہیں کرتا۔ اگر فصیح الدین کو علمی تکبر تھا، تو اسے خود بخود اپنی غلطی کا اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے تو اسے جاہل ہی بنا دیا اور وہ تو شکستہ دل واپس گیا ہے۔ درویش کے حکم پر، شاگرد، دہلی گیا اور فصیح الدین سے معذرت کی۔ جب مولانا کو اصل بات معلوم ہوئی تو ننگے پیر، دہلی سے اجودھن آئے۔ بابا فریدؒ کے پیر پکڑ لیے۔ معافی مانگی اور بیعت ہونے کی اجازت طلب کی۔ جواب بے حد پُر مغز تھا۔ شرط تھی کہ اپنے علمی تکبر اور دین کو بحث مباحثہ کے مغالطّوں سے باہر آنا ہوگا۔ فصیح الدین اسکے بعد پوری زندگی بابا فریدؒ کی چوکھٹ سے باہر نہ جا سکے۔ یہ صوفی کا جمال نہیں بلکہ کمال ہے۔ وہ لوگوں کے دل محبت سے جیتتا ہے۔ انکو احساس کمتری میں مبتلا کر کے نہیں۔

زندگی میں بہت سے لوگ نظر آئینگے جو محدود اکتسابی علم کی بدولت، مختلف موضوعات پر دلیل سے بات کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ یہ اپنے علم کو احساسِ برتری کا ہتھیار بنا کر لوگوں میں ممتاز ہونا چاہتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ وقتی طور پر برتری حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ چند سو

یا چند ہزار کتابیں پڑھ کر یہ عالم تو بن جاتے ہیں۔مگر علم کی باطنی کیفیت کو کبھی نہیں جان سکتے۔محدود دائرے میں زندگی گزار دیتے ہیں۔لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔اس طرح کے لوگوں کا حلقہ ارادت بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔مگر یہ تصوف کے قافلے کے مسافر نہیں ہوتے۔کلغی والی ٹوپی پہن کر نمایاں تو ہو جاتے ہیں مگر روحانیت کے میدان میں طفلِ مکتب تک نہیں ہوتے۔یہ وہ لوگ ہیں جنہیں پوری عمر، وحدت کے کنویں کا پانی نصیب نہیں ہوتا۔پیاسے ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔کئی بار تو انہیں پیاسے ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا۔تصوف کے سمندر کے ساحل تک جانا بھی انہیں نصیب نہیں ہو پاتا۔صوفی تو اس انجانے سمندر میں ڈبکیاں لگاتا ہے۔عشق کی کشتی پر بیٹھ کر ایسے سفر پر گامزن رہتا ہے جسکی کوئی آخری منزل ہے ہی نہیں۔صوفی، عالم نہیں ہوتا۔صاحب علم ہوتا ہے۔صاحب جذب ہوتا ہے۔صاحب کیفیت ہوتا ہے۔

ہرکہ در بند نام وآوازہ است

خانہ اوبروں دروازہ است

ترجمہ: جو شخص نام وشہرت کی فکر میں ہے۔اسکا گھر، دروازے سے باہر ہے۔

صوفی اور درویش ہر دور میں موجود ہوتے ہیں بلکہ قائم رہتے ہیں۔یہ بے حد عجیب سے لوگ، بے نیازی کی زندگی گزارتے ہیں۔عام لوگوں سے حد درجہ مختلف بلکہ متضاد۔جاہ وحشم سے دور۔تعریف سے دور۔دنیاوی آسائشوں سے کوسوں دور۔یہ تو اس درجہ متحرک ہوتے ہیں کہ اگر کسی جگہ پر ریاضت کیلئے بیٹھ جائیں تو پرندے انہیں بے جان سمجھتے ہوئے انکے سروں پر گھونسلے بنا لیتے ہیں۔بادشاہوں، حکمرانوں کے دربار سے بہت دور رہنے والے لوگ، عشق کے سفر کے وہ مسافر ہوتے ہیں جنکے سامنے دنیا، بے حیثیت ہو جاتی ہے۔کسی بھی اہمیت کی حامل نہیں رہتی۔

فریدا تن سُکا، پنجر تھیا، تلیاں کھونڈیں کاگ

اجے سُ رَب نہ بَوہڑیو، دیکھ بندے کے بھاگ

تصوف کے متحرک مگر ساکت سمندر میں صوفی ہر دم غوطہ زن رہتے ہیں۔عشق جیسی آگ میں جلنے والے، یہ لوگ میلے کچیلے کپڑوں میں ہمارے درمیان بظاہر معمولی سی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔مگر یہ انتہائی قیمتی لوگ، اس دنیا کے اصلی بادشاہ ہوتے ہیں۔خدا کی طرف سے یہی درویش فیصلے کرتے ہیں اور ہمارے جیسے بابو لوگ، کاغذوں پر دستخط کر کے سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہمارے فیصلے ہیں۔صاحبان! فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں اور پیہم ہوتے ہیں۔فقر کے خزانے کے مالک یہ صوفی لوگ، بے حد چالاک ہوتے ہیں۔آپکا سب کچھ لے لیتے ہیں۔اپنے کھیسے میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔پھر کسی بھی وقت آپکو سب کچھ لوٹا دیتے ہیں۔بہت زیادہ کر کے۔شائد ہمارے جیسے عامی لوگوں کی برداشت سے باہر۔

راؤ منظر حیات